اقبال اور اشتراکیت۔ نکاتِ اتصال واختلاف

ڈاکٹر فاروق عزیز

اشتراکیت انسانی تاریخ کی اس پہلی منضبط کوشش کا نام ہے جب انسان نے مذہب کی اساس کو مسترد کرتے ہوئے ایک جداگانہ تصور کی بنیاد پر ایک مکمل فلسفہ حیات پیش کرنے کی کوشش کی۔ اشتراکیت کو درحقیقت سرمایہ داری کے گناہوں نے جنم دیا۔ اس نظریئے کے تحت فلسفہ واستدلال کی بنیاد پر خدا کے وجود سے انکار کیا گیا کیونکہ اس تحریک کے ڈانڈے بھی بہرحال اہلِ مغرب کی کلیسا کے خلاف جنگ سے جا ملتے ہیں۔ کلیسا کا انحصار خدا پر تھا لہٰذا اشتراکیت اور مغرب دونوں نے مکمل طور پر خدا کے وجود سے انکار کر دیا۔

اٹھارویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد نجی ملکیت کے ادارے نے انسانوں پر جو حیاسوز مظالم ڈھائے وہ تاریخ انسانی کا ایک انتہائی شرمناک باب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نجی ملکیت کے ادارے کے خلاف ایک شدید ردعمل اُبھرا جس کی اساس اس ادارے کی نفی اور تمام دنیا کے مزدوروں کی یکجائی پر رکھی گئی۔ نجی ملکیت کی نفی اس سے قبل بھی انسانی تاریخ میں ہوتی رہی ہے تاہم اس دفعہ یہ استرداد اس انفرادیت کے ساتھ کیا گیا کہ اس کے لئے باقاعدہ ایک فلسفیانہ بنیاد بلکہ پورا نظام حیات پیش کیا گیا جسے اشتراکیت کا نام دیا گیا۔

اس فلسفہ حیات کی بنیاد ہیگل کے جدلی تصور پر رکھی گئی مارکس نے اس جدلی عمل کو عالم فکر سے نکال کر معاشی تنظیم پر منطبق کر دیا[۱]۔ اس کے نزدیک تاریخ کے ہر دور میں زندگی کی اصل بنیاد اس عہد کا معاشی نظام ہوتا ہے اور اسی پر تمدن کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ایک معاشی نظام کچھ عرصے تک انسانوں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے پھر اس نظام کے اندر اس کی کچھ مخالف قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کی شکست وریخت کے درپے ہو جاتی ہیں اس کشمکش کے نتیجے میں ایک نیا نظام وجود میں آ جاتا ہے اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ وہ قوت جو یہ عمل انجام دیتی ہے وہ کارل مارکس کے نزدیک ''تاریخ کی قوت'' (Force of History) کہلاتی ہے۔[۲]

اخلاق و مذہب، علوم وفنون اور تمدن و معاشرت سب کے سب ابن الوقتوں کی طرح اپنے زمانے کے غالب معاشی نظام میں رنگ جاتے ہیں ان کی حیثیت صرف متبعین کی ہوتی ہے یہاں تک کہ اخلاقی اقدار بھی تبدیلیوں کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہیں۔[۳]

مارکس کے نزدیک ہر معاشی نظام حالاتِ پیداوار اور پیداواری قوتوں کی ہم آہنگی کا مظہر ہوتا ہے تاہم کسی نظام کی تمام پیداواری قوتیں جو اس کی وسعت میں سما سکتی ہوں جب اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ جاتی ہیں تو اس وقت اس معاشی نظام میں نئی پیداواری قوتیں اُبھر آتی ہیں۔ نئی ایجادات و انکشافات کی وجہ سے طریق پیدائش میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس کے نتیجے میں پیداواری حالات اور پیداواری قوتوں کے مابین موجود ہم آہنگی نہ صرف یہ کہ ختم ہو جاتی ہے بلکہ ان کے مابین تصادم شروع ہو جاتا ہے جو پرانے نظام کے خاتمے اور نئے نظام کے قیام پر منتج ہوتا ہے۔[۴] اس اعتبار سے مارکس نے انسانی سماج کے تین ادوار قرار دیئے ہیں ان ادوار کا تعین سماج میں لین دین کی شکل پر ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلا مرحلہ سرمایہ دارانہ سماج (Capitalist Society) دوسرا مرحلہ اشتراکی سماج (Socialist Society) اور تیسرا اور آخری مرحلہ کمیونسٹ سماج (Communist Society) ہے۔ ان میں سے پہلے مرحلے میں لین دین قدرِ تبادلہ (Exchange Value) ثانی الذکر میں قدرِ اصل (Intrinsic Value) جبکہ آخر الذکر میں قدرِ استعمال (Use Value) پر ہوتا ہے۔ یہ سماج کا بلند ترین مرحلہ ہے جس میں صرف چیزوں کی قدر استعمال دیکھی جائے گی گویا تبادلے کی بنیاد محض فرد کی ضرورت ہوگا نفع یا معاوضہ خدمت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے کہ ایک کمیونسٹ غیر مساوی کمائی کی مساوی تقسیم چاہتا ہے۔[۵]

اس فلسفے کی رو سے کائنات اول تا آخر ایک مادی وجود ہے جس میں یا اس سے باہر خالق یا خدا کا کوئی تصور نہیں ہے انسانی ارتقاء اور ترقی محض اقتصادی کشمکش و پیکار کا ثمر ہے۔ انسان کسی ارادہ و اختیار کا مالک نہیں اور محض حالات کا پروردہ ہوتا ہے لہٰذا مستقل اخلاقی اقدار کا کوئی وجود نہیں ہے۔[۶]

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اقبال نے ان تمام اُمور کے باوجود اس نظام کی حمایت کیوں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انقلاب کی خواہش اقبال کی اشتراکی تحریک میں دلچسپی کا ایک سبب ہو سکتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس میں ان کے انقلاب کی خواہش پایہ تکمیل تک پہنچ سکتی تھی۔ مزید برآں ایک محدود تناظر میں یہ تحریک اقبال کے افکار و خیالات سے ہم آہنگ تھی لہٰذا اس کی طرف اقبال کا جھکاؤ بڑی حد تک فطری تھا دونوں کے فکری نقاطِ اتصال مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دونوں اندازِ کہن سے بےزار اور نئی دنیا کی تعمیر چاہتے ہیں (تاہم یہاں مجوزہ نئی دنیا کی تعمیر کا مقصد، نقوش، تعمیر کے لئے لائحہ عمل اور طریق کار کا فرق بہر حال ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے)۔

۲۔ دونوں رنگ، نسل، زبان یا علاقائی بنیادوں کی بجائے بین الاقوامیت کے علمبردار ہیں اشتراکیت تمام دنیا کے مزدوروں کی یکجہتی کے نعرے پر اُٹھی تھی تو اقبال بھی بنی آدم کی یکجائی کے علمبردار ہیں۔

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم ''کَنَفسٍ وّاحِدَہ''[۷]

۳۔ دونوں معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی بحالی چاہتے ہیں۔

۴۔ دونوں سود کے خلاف ہیں اور اس کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ تاہم یہاں ان بنیادوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس کی اساس بنتی ہیں۔ اقبال ظاہر ہے احکام قرآنی کی بنیاد پر ایسا چاہتے ہیں کہ جب کہ سوشلزم سرمایے اور نجی ملکیت کی نفی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔

۵۔ سوشلزم کے تحت معاوضہ صرف محنت کا ہے ایک محدود تناظر میں اقبال بھی اس کے موئید ہیں۔

۶۔ دونوں زمین کی نجی ملکیت کے خلاف ہیں لیکن سوشلزم اس وجہ سے ایسا کرتا ہے کہ وہ وسائل پیداوار کی ملکیت کے ادارے کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا اس کے برعکس اقبال اس کی بنیاد قرآن مجید سے لاتے ہیں جس میں انسان کی محنت سے حاصل شدہ سرمایہ پر اس کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

۷۔ سوشلزم محض نظریہ ہی نہیں عمل بھی ہے اقبال بھی حرکت و عمل کے داعی ہیں۔

۸۔ دونوں مغربی جمہوریت کے مخالف ہیں۔

۹۔ اقبال بھی زندگی کو ایک مخصوص پس منظر میں ہیگل کے نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہیگل کی طرح اقبال کا تصورِ زندگی بھی ارتقاء پذیر ہے:

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات
بڑی تیز جولاں، بڑی زودرس!
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس!
زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے[۸]

اسے بآسانی ہیگل کے دعویٰ (Thesis) جوابِ دعویٰ (Antithesis) اور مرکب (Synthesis) کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' اس نقطہ نظر کی ترجمان کہی جاتی ہے[۹] تاہم ایک بنیادی فرق بہرحال مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہیگل کے نزدیک تاریخ عالم روحِ مطلق کی نمائش گاہ ہے اور تمام انسان اور ان کی صلاحیتیں سب کی سب اسی روحِ مطلق کی آلہ کار ہیں جو بدترین جبریت ہے۔ مزید یہ کہ ہیگل کے

نزدیک اس کشمکش کا نتیجہ بقائے اصلح ہے جب کہ اقبال کے نزدیک کشمکش کی اصل بنیاد حق و باطل کی کشمکش ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی[۱۰]

۱۰۔ ایک محدود حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کی سوشلزم میں دلچسپی یا اس کی حمایت اس بنیاد پر بھی تھی کہ ''میرے دشمن کا دشمن میرا دوست''۔ اقبال کی مغربی تہذیب سے دشمنی اور مخالف کوئی ڈھکی چھپی نہیں لہٰذا جب اشتراکیت مغربی سامراج کے مخالف کی حیثیت سے سامنے آئی تو اقبال نے اس کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ پایا۔

غالباً یہی وجوہات تھیں کہ جب سوشلزم نے کمزور اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ترین طبقے یعنی مزدوروں کے لئے آواز بلند کی تو اقبال نے اسے اپنے دل کی آواز جانا:

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت[۱۱]

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار!
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار!
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار۔[۱۲]

کارل مارکس کو جو اشتراکیت کا فکری معمار ہے اسے اس طرح خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیحِ بے صلیب!
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب[۱۳]

متذکرہ بالا اشعار کے علاوہ کلام اقبال سے اور بھی کئی حوالے دیئے جاسکتے ہیں جن سے اقبال کی اس تحریک کے لئے پسندیدگی مترشح ہوتی ہے اور اس حوالے سے بعض لوگوں کا خیال اس جانب گیا ہے کہ وہ اقتصادیات کے موضوع پر عقیدتاً ایک اشتراکی واقع ہوئے تھے۔اس عنوان پر علامہ کو بہت رعایت دی جاتی ہے تو ان کے متعلق یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ ''اگر اقبال خود کمیونسٹ نہیں تھا تو کم از کم کمیونزم کا ایک سرگرم موئید و حامی ضرور تھا''۔[۱۴] اس طرح مولانا عبدالسلام ندوی کی رائے میں ''ڈاکٹر (اقبال) صاحب مختلف حیثیتوں سے اشتراکیت کی تائید کرتے ہیں اور ان کو اس نظام حکومت میں اسلامی نظام حکومت کے بہت سے اجزاء ملتے ہیں''۔[۱۵] خلیفہ عبدالحکیم کی رائے میں اقبال ایک مسلم سوشلسٹ ہے۔[۱۶] اسی طرح صفدر میر کے خیال میں بھی اقبال کی سوشلزم سے ہمدردی ڈھکی چھپی نہیں [۱۷]۔ پروفیسر عزیز احمد شہر مرغدین کے اوصاف پر بحث سے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ''الارض للہ کا ترجمہ اگر جدید اصطلاحوں میں کیا جائے تو اس کے کم و بیش یہی معنی ہیں کہ تمام ذرائع پیداوار اجتماعی ملکیت میں ہوں نہ کہ کسی فرد کے''۔[۱۸] بالفاظ دیگر ان کے نقطہ نگاہ سے یہ نظم ایک مکمل اشتراکی فکر کی حامل ہے۔

اس حوالے سے دوسری رائے یہ ہے کہ ''اقبال کو کمیونسٹ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ اقبال درحقیقت ایک ہندو تھا اور اسکا نام اقبال چند تھا''۔[۱۹] حقیقت بہرحال یہی ہے کہ اقبال کو ایک کمیونسٹ ثابت نہیں کیا جاسکتا یہی وجہ ہے کہ خود اقبال کو کمیونسٹ قرار دینے والوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ ''اقبال کے اسلامی اشتراکیت کے تصور میں یقیناً کسی قدر ابہام ہے اور بہت سی کڑیاں مربوط نہیں ہیں''۔[۲۰] یا یہ کہ ''معاشی سطح پر وہ (اقبال) کارل کارکس کی اشتمالیت کے بنیادی تصورات کو قریب قریب پوری طرح مانتے ہیں کارل مارکس سے ان کے اختلافات دو ہیں ایک تو وہ بہ حیثیت فلسفہ مادی جدلیت کو رد کرتے ہیں دوسرے یہ کہ تاریخ کی معاشی تطبیق کے بعض اصولوں سے انہیں اتفاق نہیں''۔[۲۱]

یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص اسلام کے بنیادی تصورات کو تو قریب قریب قبول کرے ساتھ یہ بھی کہے کہ اسے توحید و رسالت سے اتفاق نہیں۔[۲۲] اس طرح خواجہ محمد زکریا کو تسلیم کرنا پڑا کہ ''اقبال کے فلسفے کا تار پود اسلام کے عقائد سے بنا ہے اس لئے خدا اور مذہب سے متعلق اشتراکی نقطہ نگاہ انہیں قبول نہیں۔''[۲۳]

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تمام تر ہمدردی کے باوجود اقبال کی نظر میں سوشلزم کیا معاشی مسئلے کا حل بھی ہے؟ اسکا سیدھا سادا اور قطعی جواب نفی میں ہے:

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو[۲۴]

کیونکہ اس صورت میں بھی کوئی جوہری تبدیلی رونما نہیں ہوتی:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی [۲۵]

صرف یہ تبدیلی ہوگی کہ شیریں کے خریدار بدل جائیں گے خسرو نہ سہی کوہکن سہی:

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست [۲۶]

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ حکمران پرویز ہو یا کوہکن خرابی کہیں اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اشتراکیت کے بنیادی اُصول جن پر اس نظام کا تانا بانا بنا گیا ہے کسی مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ سوشلزم کی سب سے بنیادی خامی یہ ہے کہ اس نظام میں لوگوں کے پاس نجی ملکیت اور منافع کی عدم موجودگی کی وجہ سے کام کرنے کے لئے کوئی جذبہ محرکہ نہیں ہوتا [۲۷]۔ اس خرابی کی جانب اقبال نے بہت پہلے نشاندہی کر دی تھی:

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستہء او را اساسِ محکمے؟ [۲۸]

یہاں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اقبال کو اس فلسفے کے خام ہونے کا علم تھا تو انہوں نے اس کی حمایت کیوں کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال نے انقلاب روس کو منزل ''لا'' تصور کیا تھا اور انہیں اپنی فطری رجائیت پسندی کی وجہ سے یہ قوی اُمید تھی کہ روس ''لا'' کے مرحلے کے بعد ''الا'' کے مرحلے میں داخل ہو جائے گا۔ [۲۹] اسی بنیاد پر اقبال سوشلزم اور اسلام میں سوائے دہریت کے اور کوئی فرق محسوس نہیں کرتے گویا اصل فرق محض ''لا'' اور ''الا'' کا ہے۔ [۳۰] اس وجہ سے ابوجہل طعنہ دیتا ہے کہ اسلام میں مساوات کا تخیل مزدکی ہے:

ایں مساوات، این مواخات است عجمی
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است [۳۱]

اپنی اسی رجائیت کی بناء پر انہیں اُمید تھی کہ جب انقلاب کے بعد روس میں حالات صحیح ہوں گے تو عین ممکن ہے کہ روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو۔ [۳۲] ''باقی رہا سوشلزم سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اُٹھایا ہے''۔ [۳۳] یہی وجہ ہے کہ جمال الدین افغانی کے ذریعے ملتِ روسیہ کو ''مقامِ الاّ'' کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں انقلاب منزل ''لا'' تھی لہٰذا اب ''الا'' کی طرف چلو کیونکہ یہی بقاء کا راستہ ہے۔

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی
دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں
قیصریت را شکستی استخواں
کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں
سوئے آں دیرِ کہن دیگر مبیں
کردۂ کارِ خداونداں تمام
بگذر از لا جانبِ الا خرام[۳۴]

لیکن اقبال کی توقع کے برخلاف روسی ایسا نہیں کر سکے اور نتیجے کے طور پر محض ستر (۷۰) سال کے عرصے میں روسی مملکت مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ اشتراکیت ایک ایسا انقلاب تھا جو فکری اساس سے محروم تھا لیکن اقبال جس انقلاب کے خواہشمند ہیں وہ محض احوال کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ وہ زندگی کو تبدیلیِ احوال کیساتھ نئی وسعتوں اور رفعتوں سے بھی آشنا بھی کرتا ہے۔ ایک ایسا ہمہ گیر انقلاب جو سارا منظر تبدیل کر دے۔[۳۵] یہ راہ دیگر تمام نظاموں کی ناکامیابی کے بعد صرف اور صرف اسلام کی رہ جاتی ہے:

جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے[۳۶]

کیونکہ یہ خدا کا آخری پیغام ہے جسے بہر حال غالب آنا ہے:

بے خبر! تو جوہرِ آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے[۳۷]

❁...❁...❁

حوالہ جات و حواشی

1. Karl Marks, *Das Capital*, Vol. 1, p.19.

۲۔ محمد مظہر الدین صدیقی، اشتراکیت اور اسلام، ص ۱۳۹۔

3. Karl Markes, *Selected Workes*, Vol. 1, p.12.

۴۔ صدیقی، اشتراکیت اور اسلام، ص ۱۴۰۔

۵۔ مولانا وحید الدین خان، سوشلزم اور اسلام، ص ۱۲۔

۶۔ ہیرلڈ لاسکی، اشتراکی منشور، پیش لفظ، از انجلز۔

۷۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی (جاوید نامہ)، ص (۶۶۹) ۸۱۔

۸۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اُردو (بال جبریل)، ص (۴۱۹) ۱۲۷۔

۹۔ محمد حنیف رامے، اقبال اور سوشلزم، مرتب خواجہ محمد زکریا، اقبال اور اشتراکیت، ص ۲۳۔

۱۰۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اُردو (بانگ درا)، ص (۲۲۳) ۲۲۳۔

۱۱۔ ایضاً (ضرب کلیم)، ص (۶۰۰) ۱۳۸۔

۱۲۔ ایضاً ص (۵۹۸) ۱۳۶۔

۱۳۔ ایضاً (ارمغان حجاز)، ص (۶۵۰) ۸۔

۱۴۔ عبدالرحمٰن طارق، جوہر اقبال، ص ۲۷۷۔

۱۵۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص ۳۵۶۔

۱۶۔ خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۲۰۷۔

17. M. Safdar Mir, *Iqbal the Progressive*, pp. 118-119.

۱۸۔ عزیز احمد، اقبال کی نئی تشکیل، ص ۴۲۵۔

۱۹۔ غلام احمد پرویز، اقبال اور قرآن، ج ۲، ص ۲۰۷۔

۲۰۔ عزیز احمد، اقبال کی نئی تشکیل، ص ۴۲۵۔

۲۱۔ ایضاً ص ۳۵۶۔

۲۲۔ رحیم بخش شاہین، اقبال کے معاشی نظریات، ص ۱۱۱۔

۲۳۔ محمد حنیف رامے، اقبال اور سوشلزم، مرتب، خواجہ محمد زکریا، اقبال او ر اشتراکیت، ص ۲۷۔

۲۴۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو (ارمغان حجاز)، ص (۶۵۳) ۱۱۔

۲۵۔ ایضاً (بال جبریل)، ص (۳۳۲) ۴۰۔

۲۶۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی (پیام مشرق)، ص (۳۸۰) ۲۱۰۔

۲۷۔ عبدالحمید صدیقی، اشتراکیت کی فکری بنیادیں اور ان کا تنقیدی جائزہ، چراغ راہ، سوشلزم نمبر، شمارہ ۱۰، جلد ۲۱، دسمبر ۱۹۶۷ ص ۱۷۱۔

۲۸۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی (جاوید نامہ)، ص (۶۶۷) ۷۹۔

۲۹۔ این میری شمل، شہپر جبریل، مترجم ڈاکٹر محمد ریاض، ص ۱۴۴۔

۳۰۔ عزیز احمد، اقبال کی نئی تشکیل، ص ۳۷۶۔

۳۱۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی (جاویدنامہ)، ص (۶۴۳) ۵۵۔

۳۲۔ غلام احمد، پرویز، اقبال اور قرآن، ج ۲، ص ۲۲۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۳۴۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی (جاوید نامہ)، ص (۶۶۷) ۷۹۔

۳۵۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۱۳۸۔

۳۶۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو (ارمغان حجاز)، ص (۶۵۴) ۱۲۔

۳۷۔ ایضاً (بانگ درا)، ص (۱۹۲) ۱۹۲۔